© rasailojaraid.com

مشفق خواجہ

۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء کو پاکستان کے اہلِ علم نے بڑے دُکھ سے یہ خبر پڑھی کہ ملک کے معروف اہلِ نظر اور ادیب مشفق خواجہ وفات پا گئے اور انہیں کراچی میں ان کے والدین کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ یہ خبر کیا تھی! اہلِ نظر پر برق بن کر گری۔ انہیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ جس سدا بہار قلم سے سالوں تک لطف اندوز ہوتے رہے آج موت نے اسے خاموش کر دیا ہے۔ اہل ادب کی تحریروں پر مشفق خواجہ کے قلم نے جس خوب صورتی سے تبصرے کیے ہیں، اُن کی لطافت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس مصنف کی کتاب مشفق خواجہ کے زیر نقد آئی، اس نے خود بڑھ کر تبصرہ نگار (مشفق خواجہ) کے قدم لیے اور ان کے نقد و تبصرہ پر جھوم اُٹھا۔

چنانچہ جن لوگوں نے سخن ہائے نا گفتنی پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ادبِ لطیف کا مفہوم کیا ہے؟ مثلاً ایک تبصرہ 'غالب شناس یا غلبچی' کے عنوان سے لکھتے ہیں: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے نقادوں اور محققوں کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ کر دے دیا ہے کہ کلامِ غالب کو سمجھو یا نہ سمجھو، اس پر لکھو ضرور۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ملتا، وہ غالب پر طبع آزمائی کر کے اپنی سخن فہمی کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ محققوں اور نقادوں کی کوششوں سے غالب کو اس کے گناہوں کی سزا اسی دُنیا میں مل گئی۔ اب اس کا داخلِ جنت ہونا یقینی ہے۔ غالب کو جنت میں جانے کے یوں تو بے شمار فائدے ہوں گے، سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ محققوں اور نقادوں سے جان چھوٹ جائے گی۔'' (ص ۴۳)

اپنے ایک دوسرے مضمون 'تماشائے اہلِ قلم' میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں: ''حفیظ (جالندھری) نے خان صاحب کے صدا خانے (کراچی) میں اپنے جو حالاتِ زندگی ریکارڈ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرائے ہیں، ان میں ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ علامہ اقبال نے حفیظ سے کہا: ''تمہارا کلام سُن کر جتنا سکون حاصل ہوتا ہے، اتنا اپنا کلام سن کر حاصل نہیں ہوتا۔'' علامہ کی یہ خواہش بھی تھی کہ جیسی شاعری حفیظ نے کی ہے، ویسی ہی وہ بھی کرسکیں۔ اچھا ہی ہوا کہ علامہ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، ورنہ حفیظ تو ہمارے پاس دو ہو جاتے اور اقبال ایک بھی نہ ہوتا۔'' (ص ۹۶-۹۷)

ان دو مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فطرت نے طنز و مزاح میں مشفق خواجہ کو کیا سلیقہ عطا کیا تھا! مرحوم کی 'سخن ہائے ناگفتی' کو دیکھ رہا تھا تو مجھے بے اختیار ابوالکلام آزاد کا وہ مقالہ یاد آیا جو اُنہوں نے الہلال میں مرحوم مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں ''نشۂ نیم شبی کا صبحِ خمار'' کے نام سے لکھا تھا۔

۱۹۱۳ء ملک کی نامور سیاسی اور علمی شخصیات نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں آزاد پالیسی کو اختیار کرنے پر زور دیا تھا اور اس مسئلہ پر لکھنؤ میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں وقت کی معروف تعلیمی، ادبی اور سیاسی شخصیتیں شریک تھیں، مثلاً صاحبزادہ آفتاب احمد خان، خواجہ غلام الثقلین، نواب وقار الملک، محمد علی خان، مہاراجہ آف محمود آباد، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد۔ اربابِ علم کی اس جماعت میں جہاں بعض حضرات علی گڑھ یونیورسٹی کے مسئلہ پر وائسرائے کو پورے اختیارات دینے کے حق میں تھے تو چند لوگ جو 'آزاد جماعت' کے نام سے پہچانے جاتے تھے، مثلاً مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، اس رائے کے خلاف تھے۔ لیکن جب ۲۶ر جولائی کو فیصلہ کن اجلاس ہوا تو محمد علی جوہر اپنی آزاد رائے سے دست بردار ہو گئے۔ اس پر ابوالکلام نے لکھا: ''۲۶ر کی سہ پہر کو ہمارے دوست (محمد علی) کا مزاج بہت گرم تھا۔ ان کی تقریر اتنی پرجوش تھی کہ ان کی بے اعتدالی ہم کو بھی ناگوار گزری اور ان کے کان میں کہا، خدارا! ذرا لب و لہجہ نرم کیجیے..... لیکن آج ان کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ پرسوں جن لوگوں نے ان کے جوش کے انگارے سے اپنی انگیٹھیاں روشن کی تھیں، آج ان کی تقریر ہی سے جمائیاں آنے لگیں۔ پرسوں ہمارے دوست کے ہاتھ میں شامپین کے جام تھے، آج اُنہوں نے چاہا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھنڈے پانی ہی کو وائن گلاس میں بھر بھر کر تقسیم کر دیں، سوڈا بھی نہیں۔‘‘

ہم نے تقریر کا پہلا لفظ ہی چکھ کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے احباب سے کہہ دیا تھا کہ آج یا تو صرف پانی ہے یا پانی اس قدر ملا دیا ہے کہ بو اور ذائقہ دونوں کا پتہ نہیں۔

مرا اے مئے فروش آن بیخودی نیست
مگر در بادہ آبے کردہ باشی

سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پر خدا کے لیے اعتماد کیجیے۔ لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی۔

قسم سچی سہی پھر بھی کھانے کی ضرورت کیا ہے۔

ہمارے دوست کو معلوم نہیں کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ سچی قسموں اور عہد و پیمان میں نہیں بلکہ کسی اور ہی چیز میں ہے۔ سچا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں بلکہ اپنی استقامتِ اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دنیا سے لی ہیں۔‘‘[(۱)]

مشفق خواجہ شعر بھی کہتے تھے، جن سے ان کی پاکیزہ شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، فرماتے ہیں:

وہ کون تھا جو گیا ہے اداس کر کے مجھے
وہ کون ہے جو مجھ میں اداس رہتا ہے

ہزار بار خود اپنے مکان پر دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

نیاز فتح پوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ اکبر الہ آبادی سے ملے تو اکبر نے انہیں اپنا یہ شعر سنایا:

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں میں
کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

© rasailojaraid.com

(۱) یہ ساری دلچسپ بحث الہلال، ۲۰، ۲۶ر فروری، ۱۲ر مارچ ۱۹۱۳ء میں دیکھی جاسکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

نیاز نے اکبر سے کہا کہ مجھے اس شعر کی بجائے آپ کا دوسرا شعر زیادہ پسند ہے:

اکبر نے بڑی بے تابی سے اس شعر کے بارے میں پوچھا تو نیاز نے کہا:

آرزو ہے مجھے اک شخص سے ملنے کی بہت
نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا

نیاز کا کہنا ہے کہ اکبر نے جونہی اپنا یہ شعر سنا آبدیدہ ہو گئے، نیاز کو گلے سے لگایا اور کہا تم نے مجھے بھولا ہوا اکبر یاد دلا دیا۔

ہمیں علم نہیں کہ مشفق خواجہ کے ساتھ بھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مشفق خواجہ ان چند لوگوں میں سے تھے، جن کی نگاہ زندگی کے حقائق پر رہتی تھی۔ افسوس!

روئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد!

© rasailojaraid.com